تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ فکرِ اسلامی کی روشنی میں

An Analysis of the theory of the Clash of Civilizations in the Light of Islamic Thought

Dr. Fareed Ud Din Tariq*

ABSTRACT

The quintessence of the theory of "The Clash of Civilizations" presented by American political expert Samuel P. Huntington in his book 'The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order' is that the cause of wars and disputes in the world, after the end of the cold war between the United States and Russia, will not be various ideologies but the main reasons behind discord and strife will be cultural and religious identities of people. Far-sighted persons know that before Huntington many western thinkers have also expressed similar views. Western concept of 'The Clash of Civilizations' is such a reality that existed centuries before P. Huntington's book and is there even today. The early signs of this civilizational clash are present in the establishment of European colonization and in the history of crusades. Professor Huntington explains that the clash between Islam and western civilization has become inevitable. Clearly stating the hidden agenda of establishing global western supremacy, he has expressed his apprehension that Islam can upset the current global power balance. Therefore, he has proposed to the western leadership that it should adopt such exploitative strategies against other civilizations so that it only can remain the dominant civilization in the world. It is for this reason that the west is continuously following an aggressive policy against other civilizations. Being mindful of the Islamic way of thinking, a research-based analytical review of this concept of civilizational clash has been taken in this paper. In the light of Islamic teachings and Muslim thought, it has been made clear that Islam rejects the concept of the clash of civilizations rather it teaches civilizational coexistence and holding dialogue. This is the concept through which peace and security can prevail in the world.

Keywords: *Clash of Civilizations, Huntington, Islamic Thoughts, Western Supremacy, Peaceful Coexistence.*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، آزاد جموں وکشمیر یونی ورسٹی، مظفر آباد

تہذیبوں اور قوموں کے درمیان مسابقت اور کش مکش انسانی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ عہد حاضر میں یہ کش مکش تصادم میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ مغربی تہذیب و معاشرت اور اسلامی تہذیب و معاشرت، دو مختلف طریقہ ہائے زندگی ہیں۔ ان دونوں تہذیبوں میں اقدارِ مشترک کم ہیں اور تضاد و تخالف کے پہلو زیادہ ہیں۔ زیر بحث "تہذیبوں کے تصادم" کا نظریہ جسے امریکی ماہر سیاسیات، سیموئل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel Phillips Huntington)[1] نے پیش کیا جس کا لُبِ لباب یہ ہے کہ "(امریکہ اور روس کے درمیان) سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں تنازعات اور جنگوں کا باعث مختلف نظریات نہیں ہوں گے بلکہ تنازعات کی بنیادی وجوہات لوگوں کی ثقافتی اور مذہبی شناختیں ہوں گی۔ پروفیسر سیمویل پی ہن ٹنگٹن یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان تصادم ناگزیر ہو چکا ہے۔ ہن ٹنگٹن نے اپنے اس خدشے کا بھی برملا اظہار کیا ہے کہ اسلام کا عالمی تحرّک طاقت کے موجودہ توازن کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مغربی قیادت اور مفکرین کو تجویز کیا ہے کہ مغرب کو دوسری تہذیبوں کے خلاف ایسی استحصالی حکمت عملی پر کاربند ہونا چاہیے کہ صرف وہی دنیا کی بالادست تہذیب کے طور قائم رہ سکے۔[2] سوال یہ ہے کہ مغرب کے اس نظریۂ تصادم کو اسلام کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اس مقالے میں ہن ٹنگٹن کے نظریہ تصادم، اس کی تصریحات اور اہم دعوؤں پر اسلامی فکر و تعلیمات کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور تہذیبوں کے تصادم کے بجائے بقائے باہمی پر زور دیا گیا ہے۔

سابقہ تحقیقات کا جائزہ

زیر بحث تہذیبی تصادم کے نظریے کے حق میں مغربی مفکرین کی طرف سے بہت سے مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ مختلف ویب سائٹس پہ بھی اس نظریے کے حق میں تحریری مواد کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ مغرب کے اس نظریۂ تصادم کا اسلامی فکر و تعلیمات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے۔ اس موضوع پر اردو میں قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ اس حوالے سے ایک مقالہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ملائشیا کے ایک

۱۔ پروفیسر سیموئل فلپس ہنٹنگٹن، اپریل ۱۹۲۷ میں امریکہ میں پیدا ہوئے گریجویشن کے بعد امریکی فوج میں ملازمت اختیار کی، ہارورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہیں شعبہ سیاسیات میں تدریس و تحقیق سے وابستہ رہے، وائٹ ہاوس میں کوآرڈینیٹر پلاننگ فار نیشنل سیکورٹی کونسل (۱۹۷۷-۷۸) اور چیئرمین ہارورڈ اکیڈمی فار انٹرنیشنل اینڈ ایریا اسٹڈیز بھی رہے۔ خصوصی دلچسپی کے امور میں سماجیات اور قومی سلامتی کے امور میں حکمت عملی کی تشکیل شامل ہیں۔ دور حاضر میں امریکی عسکری یلغار اور تہذیبی تصادم کے نظریۂ کو فکری جواز فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

2 -Samuel Phillips Huntington ,The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order, Simon & Schuster New York, 1996, p.34

پروفیسر ڈاکٹر محمد ممتاز علی نے لکھا تھا۔ اس مقالے میں انھوں نے مغرب کی موجودہ فکری اور امریکی دانشور پروفیسر سموئیل پی ہن ٹنگٹن اور اسلامی تحریک کے فکری راہنما پروفیسر خورشید احمد[1] کی فکر اور خیالات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ علمی مجلہ Encounter میں ستمبر ۱۹۹۵ میں شائع ہوا۔ لیکن یہ مقالہ بھی پی ہن ٹنگٹن اور پروفیسر خورشید احمد کے افکار کے تقابلی مطالعے تک محدود ہے۔

منہج تحقیق

اس تحقیقی مقالے کی تیاری اور نتائج کے حصول کے لیے تجزیاتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ تہذیبی تصادم کے نظریہ پر بحث اور اس کا اسلامی فکر کے تناظر میں جائزہ لینے سے قبل تہذیب و ثقافت کے بنیادی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔

تہذیب و ثقافت کا مفہوم

تہذب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی شاخ تراشی کرنا، پاکیزہ کرنا، درست کرنا ہے، اصلاح کرنا ہے۔ لسان العرب میں تہذیب کے لغوی معنی چھانٹنے، اصلاح کرنے، سنوارنے اور پاکیزہ کرنے کے ہیں۔[2] ثقافت کے لغوی معنی ہیں زیرک، سبک، اور چالاک ہونا ثقف کے معنی سیدھا کرنا، مہذب بنانا، تعلیم دینا ہے اور الثقاف نیزوں کو سیدھا کرنے والے کو کہتے ہیں۔[3] انگریزی کا لفظ کلچر عربی لفظ ثقافت کے ہم معنی ہے۔ لفظ کلچر (Culture) معنی زراعت، فلاحت، پرورش، تہذیب اور (ذہنی) ترقی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان تینوں الفاظ کے معنی میں درستگی اور اصلاح کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہی معنی ان اصطلاحی تعریفوں میں نمایاں ہیں۔

۱۔ پروفیسر خورشید احمد ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے قانون اور اس کے مبادیات میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اکنامکس اور اسلامیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، جبکہ ایجوکیشن میں یونیورسٹی کی طرف سے انہیں اعزازی ڈگری عطا کی گئی جبکہ لغبر یونیورسٹی برطانیہ نے ۲۰۰۳ میں ڈاکٹر آف لیٹریچر کی ڈگری عطاء کی۔ پروفیسر صاحب کو اسلام، تعلیم، عالمی اقتصادیات کے ماہر کے طور پر بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کراچی یونیورسٹی میں پڑھایا۔ یونیورسٹی آف لیسٹر میں ریسرچ سکالر بھی رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب ۱۹۷۸ء میں وفاقی وزیر منصوبہ بندی و ترقی رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک آپ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک شاہ عبد العزیز یونیورسٹی جدہ کے وائس پریزیڈنٹ رہے۔ ۱۹۸۵، ۱۹۹۷ اور ۲۰۰۲ء میں سینٹ آف پاکستان کے رکن منتخب ہوئے اور سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے امور اقتصادی و منصوبہ بندی کے چیئرمین کے طور پر کام بھی کیا۔ پروفیسر صاحب انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد، دوسرا لیسٹر (یو کے) کی اسلامک فاؤنڈیشن کے بانی چیئرمین ہیں۔

۲ - ابن منظور افریقی، جمال الدین محمد بن مکرم، لسان العرب، دار الصادر بیروت، لبنان، ۱۹۵۶ء، ۹۲-۹۱

۳ - لویس معلوف، المنجد في اللغة، المطبعة الكاثوليكية - بيروت، ۹۴۴-۹۴۵

ڈاکٹر جمیل جالبی ثقافت کے دائرہ میں مذہب، عقائد، رسوم ورواج، معاشرت، مادی وسائل وضروریات اور زندگی کے دیگر تمام عوامل کو بھی شامل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کلچر میں مذہب "عقائد، رسوم ورواج، معاشرت، مادی معاشرت، مادی وسائل وضروریات اور زندگی کے سارے عوامل شامل ہیں"[1]

مفکرین اور ماہرین لسانیات اس کی تعریف میں مذہب، سیاست، اقتدار، آرٹ، سائنس، ٹیکنالوجی، تعلیم، زبان، رسم ورواج وغیرہ، کے علاوہ نظریات، علم، عقیدہ، نمونہ، اقتدار اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔

اس بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلچر نام ہے افکار و نظریات میں ایسے سلجھاؤ اور ترتیب کا جو عملی زندگی کے لیے بہترین بنیاد بن سکیں جبکہ تمدن اس کے مظاہر کا نام ہے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی

تہذیب وثقافت کے عناصر ترکیبی یا تکمیلی میں تصور کا دارومدار بنیادی مفہوم پر ہے۔ اگر تہذیب وثقافت کا مفہوم انسانی زندگی کے تمام اعمال ہیں تو پھر اس کے اجزائے ترکیبی میں آرٹ، معاشرتی نظم، عادات ورسوم اور مذہب وغیرہ شامل ہوں گے اور اگر اس سے مراد عقلی وذہنی سدھار اور نشوو ارتقاء ہے تو پھر اس کے عناصر ترکیبی، نظریاتی اور فکری طرز کے ہوں گے۔ ثقافت کی تعریف میں چونکہ دوسرے نقطۂ نظر کو ترجیح دی گئی ہے اس لیے محقق کے نزدیک تہذیب کے عناصر ترکیبی ذہنی وعقلی ہوں گے۔

بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی تہذیب کے عناصر ترکیبی یہ ہوسکتے ہیں:

۱۔ دنیوی زندگی کا تصور: مثلاً انسان کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ دنیا برتنے کی چیز ہے کہ نہیں؟

۲۔ زندگی کا نصب العین: مثلاً انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ سعی وجہد کس کے لیے ہے؟ وہ کون سا منتہائے مقصود ہے جسے حاصل کرنا انسان کا فرض ہے؟

۳۔ اساسی عقائد وافکار: یعنی انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد وافکار پر کی گئی ہے۔ انسان کی ذہنیت کو کس سانچے میں ڈھلنا ہے؟ وہ محرکات کیا ہیں جو نصب العین کے حصول کے لیے مخصوص عملی رنگ پر ابھارتے ہیں؟

۴۔ تربیت افراد کے اصول: یعنی انسان بحیثیت انسان کیسے ہونا چاہیے؟ وہ کون سے خصائل و اوصاف ہیں جو انسان کے اندر پیدا ہونے اور نشوونما پانے چاہئیں؟

۵۔ نظام اجتماعی کے اصول: انسان اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ انسانی تعلقات کی تقسیم کیسے ہوئی؟ خاندان،

---

۱ - جالبی، ڈاکٹر جمیل، پاکستانی کلچر، الیٹ پبلشرز لمیٹڈ کراچی ۱۹۷۳ء، ۲۷

ہمسایہ، دوست، اجنبی، ماتحت وغیرہ کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟[1]

کسی تہذیب کا تجزیہ ہم انہی عناصر کی روشنی میں کر سکتے ہیں، کیا وہ تہذیب مستحکم ہے یا فساد، اچھی ہے یا بُری؟ اس کا فیصلہ یہی عناصر کریں گے۔ ان عناصر ترکیبی پر نظر ڈالنے سے یہ بات از خود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تمام تر فکری بنیادیں، اصول اور افکار ہیں۔ انہی اصولوں کی فکری تشریح و توضیح سے تہذیب کا پورا ڈھانچہ استوار ہو گا اور انہی اصول و افکار کی عملی صورت سے تمدن (Civilization) وجود پذیر ہو گا۔ انسانی زندگی کے دو کامل اجزاء ہیں جن میں سے ایک فکر ہے اور دوسرا عمل، اس لیے کلچر فکر اور تمدن کے عملی مظاہر کا نام ہو گا۔ جس طرح فکر صالح بھی ہو سکتی ہے اور فاسد بھی، اسی طرح تہذیب صالح بھی ہو سکتی ہے اور فاسد بھی ہو سکتی ہے۔

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ اور اس کا تجزیہ

ا۔ نظریہ تصادم: "تہذیبوں کے تصادم" کا نظریہ جسے امریکی ماہر سیاسیات، سیموئل فلپس ہنٹنگٹن (Samuel Phillips Huntington) نے یوں پیش کیا:

> People's cultural & religious identities will be primary sources of conflict in the post-cold War World.[2]

بالفاظ دیگر یوں کہیے:

اب سرمایہ داری اور سوشلزم کا تنازعہ دنیا میں جنگ کا باعث نہیں بنے گا۔ اس نظریے کو سب سے پہلے اُس نے ۱۹۹۲ء میں امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ کے اندر دیے جانے والے ایک لیکچر میں پیش کیا جسے بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں امور خارجہ کے مجلے "Foreign Affairs" میں "تہذیبوں کا تصادم" کے عنوان کے تحت ایک باقاعدہ مضمون کی صورت میں شائع کیا۔ ہنٹنگٹن نے اپنے نظریے کی توسیع کرتے ہوئے ۱۹۹۵ء میں اسے باقاعدہ کتاب کی شکل دی اور اس کا نام "تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی تشکیل نو" (The Clash Of Civilization And The Remaking Of World Order) رکھا۔

"تہذیبوں کا تصادم" کی اصطلاح نے پروفیسر سیموئیل ہن ٹنگٹن کی اس مشہور زمانہ کتاب کے ذریعے دنیا بھر کو متوجہ کیا مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ ہن ٹنگٹن سے تقریباً گیارہ برس قبل مشہور یہودی مورّخ برنارڈ لیوس اپنی کتاب A Middle East Mosaic میں اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان ٹکراؤ کا تجزیہ کر چکا تھا۔ برنارڈ لیوس بھی اس میدان میں پہلا مفکر نہ تھا۔ سے قبل برطانوی مفکر آرنلڈ ٹائن بی کے لیکچرز پر مشتمل کتاب The World And The West اس موضوع کا احاطہ کر چکی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ برنارڈ لیوس اور ٹائن بی کی

---

۱ - سیّد مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ۱۴

2 -Huntington,The Clash of Civilizations, P.12

زبان علمی ہے اور سیموئیل ہن ٹنگٹن کا انداز نسبتاً عام فہم ہے۔"تہذیبوں کا تصادم" وہ حقیقت ہے جس کا وجود سیموئیل ہن ٹنگٹن کی شہرہ آفاق تصنیفThe Clash of Civilization کی رونمائی سے صدیوں قبل تاامروز موجود ہے اور مستقبل میں بھی اس تصادم کے خاتمے کے امکانات ناپید ہیں۔اس تہذیبی تصادم کے ابتدائی نشانات یورپی نو آبادیات کے قیام اور صلیبی جنگوں کی تاریخ میں موجود ہیں۔

تہذیب کے ضمن میں ایک غلط فہمی یہ ہے کہ کچھ لوگ تہذیب اور تہذیب کے مظاہر میں فرق نہیں سمجھتے اور تہذیبوں کے مظاہر مثلاً رسم رواج، لباس اور رہن سہن کے معاملات کے فرق کو تہذیبی اختلاف قرار دیتے ہیں مگر یہ ایک سطحی موازنہ ہے۔ یہ سب تہذیب کے مظاہر اور تفصیلات ہیں۔ تہذیب کی بنیاد اس کے چند اساسی نظریات ہوا کرتے ہیں۔ تہذیب اپنے تصور کائنات(World View) اور تصور خالق اور تصور انسان سے پہچانی جاتی ہے۔ عقیدہ جب فکر و عمل میں ڈھلتا ہے تو چند مظاہر سامنے آتے ہیں۔ یہی مظاہر "تہذیب" کہلاتے ہیں۔عقائد کی درستی یا خرابی کا اندازہ تہذیبی مظاہر سے ہوتا ہے۔اس لئے تہذیب ایک اعتبار سے عقائد کا اظہار ہے اور عقائد تہذیب کا باطن ہیں۔عقائد اور تہذیب میں بیج اور درخت کا تعلق ہے۔ تہذیب اپنے بنیادی عقائد اور ان کے مظاہر پر مشتمل ہوتی ہے۔[1]

خالق کائنات، کائنات، انسان اور علم کے بارے میں مختلف نظریات و عقائد تہذیبوں کے درمیان اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں سیکولر مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب، ہندو تہذیب، عیسائی تہذیب، چینی تہذیب اور بدھ تہذیب سمیت کئی بڑی تہذیبیں موجود ہیں۔ اسلامی تہذیب کے علاوہ دیگر تمام تہذیبیں اپنی مخصوص ترکیب کی بناء پر سیکولر مغربی تہذیب سے مفاہمت اور تعاون کی راہ اپنا چکی ہیں۔ عیسائیت چند صدی پیشتر ابتدائی تصادم کے بعد ہار مان چکی ہے۔ ہندو تہذیب بوجوہ ایک مکمل نظام زندگی دینے کی صلاحیت سے معذور ہے ،اس لیے ہندو اپنی تہذیبی اقدار پر اصرار کے بجائے مغربی اقدار کو اپنانے میں سبقت لے جانے میں مصروف ہیں۔ بدھ تہذیب کو نظام زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ چینی تہذیب میں موجود تاؤازم اور کنفیوشس ازم کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ان تہذیبوں کے بنیاد پر آئندہ چین اور مغرب میں ٹکراؤ ہوگا۔ مگر یہ ممکنہ ٹکراؤ محض مادی مفادات کی جنگ ہوگا جس کا تہذیبی اختلاف سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ خود تاؤازم اور کنفیوشس ازم چند اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہیں۔[2]

جس طرح انسان اپنی خوبیوں پر اصرار کرتے ہیں اسی طرح ہر تہذیب نہ صرف خیر و شر کا اپنا نظام رکھتی ہے بلکہ اس پر اصرار بھی کرتی ہے۔ مختلف تہذیبوں کا اپنی اقدار پر یہ اصرار کسی نہ کسی مرحلے میں تہذیبی تصادم کو جنم دیتا ہے۔ فرانس میں مسلم خواتین کو پردہ کرنے سے زبردستی روکا جارہاہے، اسکولوں میں طالبات کو اسکارف پہننے

---

۱ -سیّد مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اول و مبادی، ۲۳

۲ -فاروقی، عماد الحسن، دنیا کے بڑے مذاہب، مکتبہ جدید پریس، لاہور ۷۵، ۲۰۱۳، ۹۰، ۱۶۷

سے منع کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف مسلم خواتین پردہ کرنے کے حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ چھوٹا سا معاملہ اس تہذیبی تصادم کا صرف ایک پہلو ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ اسلامی اور مغربی دونوں تہذیبیں اپنے تصورِ کائنات اور اقدار ترک کرنے پر تیار نہیں۔ اپنی اپنی اقدار پر یہ اصرار تہذیبوں کے تصادم کو جنم دے رہا ہے۔

۲۔ نظریہ تصادم، ہن ٹنگٹن کے خدشات: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغرب جو کچھ دیکھتا ہے اس کا اس سے گہرا تعلق ہے جو مغرب دیکھنے کا آرزومند ہے اور اگر صاف صاف بات کی جائے تو سارا مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کیا دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ مثال کے طور پر ہن ٹنگٹن نے لکھا ہے:

> ”مغرب ایک طاقت ور تہذیب ہے اور آنے والے برسوں میں بھی وہ طاقتور رہے گا لیکن اس کی قوت دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں روبہ زوال ہے۔ جوں جوں مغرب اپنی اقدار پر زور دیتا ہے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتا ہے، غیر مغربی معاشروں کو بہتر تہذیبی انتخاب کا چیلنج درپیش رہتا ہے"۔[1]

ہن ٹنگٹن نے مزید کہا ہے کہ بعض معاشرے مغرب کی نقالی (Emulate) کرتے ہیں۔ وہ مغرب میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا اس تہذیب کے حاشیہ بردار (Bandwagon) بننا پسند کرتے ہیں، جبکہ دوسری تہذیبیں مثلاً کنفوشس [م: ۴۷۹ق م] کی تہذیب (اہل چین) یا اسلامی معاشرے مغربی اقدار کی نہ صرف مزاحمت کرتے ہیں، بلکہ اپنی اقتصادی اور فوجی قوت کو بڑھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، تاکہ مغرب کی مزاحمت کر سکیں یا کم از کم اس سے توازن قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ سرد جنگ کے بعد کی عالمی سیاست کا محور، مغرب کی طاقت اور ثقافت کے غیر مغربی تہذیبوں کی، طاقت اور ثقافت کے ساتھ باہمی ربط و تعاون پر استوار ہو گا۔

ہن ٹنگٹن کے بیش تر خدشات و خطرات ان خیالات کے گرد گھومتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو دینا کی سب سے بالادست تہذیب کے طور پر جاری و ساری رہنا چاہیے اور کسی دوسری تہذیب کو اپنا آپ منوانے، مغرب کی مزاحمت کا سوچنے یا توازن پیدا کرنے کی خاطر فروغ کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ غیر مغربی تہذیبوں میں، ہن ٹنگٹن کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چینی اور اسلامی تہذیبیں ہیں۔ تاہم وہ چین اور اس کے میزائلوں سے بھی زیادہ اسلام اور اس کے احیا (Revival) کو خطرناک تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بعض مغربی اصحاب، جن میں (امریکی) صدر بل کلنٹن (۱۹۹۳ء-۲۰۰۰ء) بھی شامل ہیں۔ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مغرب کو فی نفسہ اسلام کے وجود سے کسی مشکل کا سامنا نہیں بلکہ تشدد پسند اور انتہا پسند اسلامی عناصر مشکلات کا باعث ہیں۔ مگر ۱۴ سو سالہ تاریخ تو کچھ اور بتاتی ہے۔ اسلام اور مسیحیت

1 ۔ Huntington,The Clash of Civilizations, P.29

جن میں راسخ العقیدہ اور مغربی دونوں شامل ہیں، ان کے درمیان تعلقات، اکثر ہنگامہ خیز رہے ہیں۔
دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہے ہیں"۔[1]

وہ اپنے نظریے کو تقویت پہنچانے کے لیے کئی تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کرتے اور اپنے مخصوص دھمکی آمیز تصور کے تحت برنارڈ لیوس جیسے اسکالروں کی آرا پیش کرتے ہیں۔ برنارڈ لیوس کا کہنا ہے: تقریباً ایک ہزار سال قبل اس وقت سے جب اسپین کی سرزمین پر پہلے مورِیش (مسلمان) نے قدم رکھا تھا، ترکی کے ہاتھوں ویانا کے دوسرے محاصرے تک یورپ ہمیشہ اسلام کے خطرے سے دوچار رہا ہے۔[2] پھر اسی بات کو ہن ٹنگٹن نے زور دے کر کہا ہے: "اسلام ہی وہ واحد تہذیب ہے جس نے مغرب کی بقاء و سلامتی کو ہی غیر یقینی بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس نے یہ کام کم از کم دوبار کر دکھایا ہے۔"[3]

۳۔ ثقافتی و تہذیبی غلبے کی کش مکش

ہن ٹنگٹن کے نزدیک تو درحقیقت اسلامی بنیاد پرستی سے زیادہ اسلامی تہذیب ہی اصل چیلنج ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں ہے بلکہ یہ خطرہ بذات خود اسلام ہے جو ایک مختلف تہذیب ہے جس سے تعلق رکھنے والے لوگ اس تہذیب اور ثقافت کے بالاتر ہونے پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنی قوت کے کم تر ہونے کے اندیشے میں مبتلا ہیں۔[4]

ہن ٹنگٹن کے خیال میں اسلام (مسلمان) اور مغرب مختلف تہذیبیں ہیں، چنانچہ ان دونوں تہذیبوں میں عوام اپنی اپنی ثقافت کی عالم گیریت کے تصور اور اس کے بالاتر ہونے کے قائل ہیں۔ چنانچہ اگر ان تہذیبوں میں سے کوئی ایک بھی، اپنی ثقافت دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرے تو دوسری اس کی مزاحمت کرتی ہے۔ چنانچہ ہن ٹنگٹن کے مطابق یہی وہ بنیادی عوامل ہیں جو اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم کے خطرات کے شعلوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ گویا اس کے نزدیک اسلام اور مغرب کے تصادم کا سب سے بڑا عنصر اسلام کے تہذیبی اختلافات اور اس کی ثقافت کا مغرب سمیت دوسروں سے برتر ہونے کا یقین ہے۔ اور تہذیبوں کا تصادم دونوں تہذیبوں کے اس یقین سے ہی بھڑکتا ہے کہ دنیا میں ان کی ثقافت ہی بالاتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریک احیا کو مغرب میں ثقافتی آزادی کی تحریک تصور کیا جاتا ہے۔ فرانکیوس برگٹ نے اظہار کیا ہے:

---

1 - Huntington,The Clash of Civilizations, P.29

2 Bernard Lewis, A Middle East Mosaic: Fragments of Life, Letters and History, Oxford University Press, New York, 1993, p.13

3 -Huntington, The Clash of Civilizations, P.73

۴ - ایضاً، ۱۱۲، ۱۱۷-۱۱۸

"ہم نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کا تیسرا مرحلہ دیکھ رہے ہیں۔ پہلا مرحلہ سیاسی تھا، جسے (مغربی استعمار کے زیر تسلط علاقوں میں) آزادی کی تحریکوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مرحلہ اقتصادی تھا، جس کے دوران مصر میں نہر سوئز کو اور الجزائر میں تیل کی صنعت کو قومیایا گیا۔ اب آخری مرحلہ ثقافتی (غلبے اور کشمکش کا) ہے"۔[1]

بلا شبہ اسلام اور مغرب کے درمیان متعدد بڑے بنیادی ثقافتی اختلافات موجود ہیں۔ اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اسلام نے مغرب کی ثقافتی سامراجیت کی ہمیشہ مزاحمت کی ہے۔ اگرچہ نو آبادیاتی نظام کے دوران، اور اس کے بعد بھی مسلم ممالک میں مغرب کے ہمہ پہلو ثقافتی حملے کے باعث مسلم معاشروں کا ایک بڑا حصہ لادینیت (سیکولزم) کی طرف مائل ہوا اور مغربی رنگ میں رنگا گیا، لیکن اس کے باوجود یہ حملہ مسلم معاشروں کے تمام عناصر کے خلاف کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ تاہم، اسلام نے اپنی تہذیب و ثقافت کو بچانے یا پھیلانے کے لیے نہ جنگ کا سہارا لیا ہے اور نہ اس کا مقصد کے لیے لڑ تا رہا ہے۔

بہر حال یہ بات ضرور ہے کہ اسلام کی ثقافت میں یہ گنجائش ہی نہیں کہ وہ ایسے غیر ملکی نظریات اور اخلاقیات کو قبول کرلے جو اسلامی اخلاق اور نظریات سے متصادم ہوں۔ اسلام کی یہ بھی ثقافت نہیں کہ وہ اپنے اپنے ثقافتی غلبے کے لیے جنگ میں کود پڑے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی ثقافت یہ ہے کہ وہ ہر ایسی ثقافتی سامراجیت کی مزاحمت ضرور کرتا ہے جو اس پر محسوس یا غیر محسوس انداز سے ٹھونسنے کی کوشش کیا جائے۔ یوں اسلام اپنی ثقافت کو محفوظ و مامون رکھنے کے لیے جدوجہد میں مشغول ہے۔ پروفیسر خورشید لکھتے ہیں:

اسلامی احیا کا موجودہ مرحلہ مغربی نمونوں کی غلامانہ نقالی (Slavish Imitation) سے روکتا اور اس سے دور رہنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس کا یہ بھی مقصد ہے کہ اس کے پیروکاروں کو دیکھ بھال کر انتخابی نقطۂ نظر سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ انھیں بیرونی تہذیبوں میں سے کون سی بات اختیار کرنی چاہیے، اور کون سی نہیں۔ اسلامی معاشرہ اگرچہ کئی پہلوؤں سے مغربی تجربات سے استفادہ کر سکتا ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کی قیمت پر غیر ملکی تہذیبوں کو خود اپنے آپ پر مسلط ہونے دے۔[2]

اس کا واضح طور مطلب یہ ہے کہ اسلامی احیا کے لائحہ عمل میں ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو لازماً دوسری تہذیبوں پر مسلط کرے، سوائے اس کے کہ وہ خود اپنی تہذیب کا تحفظ ضرور کرے گا۔ چنانچہ اگر مغرب

1 - Shireen T. Hunter, The Future of Islam and the West, Center for Strategic and International Studies, Washington, 1998, p.73

2 -Ahmad, Khurshid. "Man and the Future of Civilization: An Islamic Perspective." Encounters 1, no. 1 (1995). p. 51

اپنے تہذیبی سامراجی پروگرام کو مسلط کرنے کا عزم و ارادہ ختم کر دے تو تہذیبوں کے درمیان تصادم کے اس خود ساختہ منظر نامے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے چاہے یہ تصادم صرف تہذیبی مقاصد پر ہی کیوں نہ مبنی ہو۔

۴۔ نظریہ تصادم اور مغرب کے مفادات: دوسرے لفظوں میں یہ تصادم ایک عالمی تہذیبی حکمرانی کے بجائے عالمی قوت واقتدار اور اثر ورسوخ کے لیے ہے۔ پھر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اسلام کے پیروکار بین الاقوامی، اقتصادی اور سیاسی نظاموں پر مغرب کی بالادستی کی مخالفت کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں مغرب کی حاشیہ بردار غیر نمائندہ اور جابر حکومتوں کی خود مغرب کی طرف سے حمایت اور مغرب خصوصاً امریکا کی طرف سے اسرائیل کی یک طرفہ حمایت وغیرہ بھی مسلمانوں کی ناراضگی کا سبب ہے۔ شیریں ہنٹر نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے:"عالم اسلام اور مغرب کے درمیان دشمنی کی سطح کا ایک اہم عامل یروشلم (فلسطین) میں مسلمانوں کے حقوق بھی ہیں۔"[1]

ان سب عوامل کے علاوہ اسلام اور تیل کے درمیان دھماکہ خیز ہنی مون (تعلق) نے بھی تصادم کے نظریے میں ایک فیصلہ کن عنصر کا کردار ادا کیا ہے۔ شیریں ہنٹر نے بتایا ہے کہ بحیرہ کیسپین، فارس، کاکیشیا کی چوٹیوں سے عرب کے صحراؤں اور وسطی ایشیا کی ڈھلانوں سمیت ہر مسلم ملک میں تیل اور گیس کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ اور مغرب کی فوجی اور صنعتی قوت کا دارومدار تیل پر ہے۔ چنانچہ شیریں ہنٹر نے اس بات پر زور دیا ہے:

> "نہ اسلام اور مغرب کے درمیان تہذیبوں کے بہت بڑے تصادم کے نظریے کا کوئی تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس سوال کا کوئی جواب ہی دیا جاسکتا ہے کہ اس تصادم کو پر امن بقائے باہمی میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ اسلام اور تیل کے درمیان دھماکہ خیز بندھن (marriage) کی پوری طرح وضاحت نہ کی جائے۔"[2]

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف ثقافتی مفادات کے علاوہ مغرب کے کئی اور سماجی واقتصادی اور سیاسی مفادات بھی ہیں جن کے لیے مغرب اپنی عالمی بالادستی کی راہ میں عالم اسلام ہی زبردست رکاوٹ ہے۔ جس کی تاریخ، ثقافتی، جغرافیائی، ارضیاتی (زیر زمین تیل، گیس اور معدنیات کے ذخائر) اور دوسری وجوہ ہیں۔ چنانچہ عام طور پر خالص مفادات کے لیے مغرب کو ان دونوں تہذیبوں کے درمیان تصادم ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔

ان حقائق سے بلاشبہ دونوں تہذیبوں کے درمیان تصادم کی اقتصادی، سیاسی اور تزویراتی (اسٹریٹجک) وجوہ اور عالمی قوت قائم رکھنے کی خواہش سامنے آتی ہیں۔ بات پر بھی زور ہے کہ استعماریت دراصل عالم گیریت (Universalism) کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔[3] اس کے ساتھ ہن ٹنگٹن کا یہ ماننا ہے کہ بہر حال مغرب اپنی اقدار، ادارے اور ثقافت دوسری تہذیبوں پر مسلط کرنے کے لیے غیر اخلاقی رویہ کا بھی مرتکب ہو رہا ہے۔

---

1 ۔ Shireen T. Hunter, The Future of Islam and the West, 170

۲ ۔ ایضاً، ۱۳

3 ۔P. Huntington,The Clash of Civilizations, P.170

اس احساسِ حقیقت کے باوجود ہن ٹنگٹن نے زور دیا ہے کہ مغرب کو دوسری تہذیبوں پر اپنی ٹیکنالوجی اور فوجی بالادستی قائم رکھنی چاہیے اور مسلم دنیا نیز چینی تہذیب کے حامل ممالک کی روایتی اور غیر روایتی فوجی قوت کے فروغ کو بہر صورت روکنا چاہیے۔[۱] پروفیسر سیموئیل پی ہن ٹنگٹن کا بنیادی مقصد عالمی سطح پر مغرب کے مفادات، دولت، قوت اور اثر و رسوخ کا تحفظ ہے۔ اسی حوالے سے موصوف نے لکھا ہے:

> "مغرب کی روبہ زوال قوت کے تناظر میں، مغربی تہذیب کے تحفظ کے لیے امریکا اور یورپی ممالک کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ باہمی سیاسی، اقتصادی اور فوجی یکجہتی حاصل کریں۔ اور اپنی پالیسیوں میں اس طرح میل پیدا کریں تا کہ دوسری تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی مملکتوں کو، ان (امریکا اور یورپ) کے درمیان اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلیش قوت کے حصول اور فروغ سے باز رکھا جا سکے۔ کیونکہ دوسری تہذیبوں کے امور میں مغرب کی مداخلت، کثیر تہذیبی دنیا میں عدم استحکام اور عالمی تصادم کا شاید سب سے زیادہ خطرناک سبب اور ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے"۔[۲]

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ ہن ٹنگٹن نے امریکا و یورپ کو ایسی استحصالی پالیسیوں پر عمل در آمد کے لیے نہ صرف ابھارا ہے بلکہ ایسی مغربی یلغار کی پرزور وکالت کی ہے جس سے دوسری تہذیبوں کو ترقی و فروغ سے روکا جا سکے اور عالمی سطح پر مغرب کی بالادستی کا عمل جاری رہ سکے۔

اسلامی تہذیب و ثقافت اور تہذیبی بقائے باہمی

اسلامی تہذیب اور ثقافت ایک الہامی ضابطہ حیات کی پیروی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت اپنے ہمہ جہت نشو و ارتقاء اور عالمگیر حیثیت کے لئے عقیدہ توحید کی مرہونِ منت ہے، یہ اسلامی تہذیب کا اہم ترین اساسی عقیدہ ہے جس کی قوت تسخیر کا کوئی عقیدہ، آئیڈیالوجی یا دین حریف نہیں ہو سکا۔ اسلام میں توحید محض ایک تصور یا نظریہ نہیں بلکہ یہ ایک زندہ و حرکی عقیدہ ہے، یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے عظیم الشان شجر طیبہ کی بنیاد ہے، یہ فرد و ملت کے پیکر حیات کی روح ہے۔ اس کے بغیر فرد و ملت کا پیکر حیات بے جان و جامد جاتا ہے۔ توحید و واحد قوت ہے جو عالمگیر معاشرے کی تشکیل، پائندار امن عالم کے قیام اور ہمہ گیر عالمی سطح پر موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضامن ہے۔

شریعت اسلامیہ نے ان مستقل اور ہمہ گیر اقدار کی حفاظت کی ہے اور اسلامی تہذیب ان اقدار کی وجہ سے ممتاز تہذیب ہے جو اپنے الہامی تشخص کے باعث تمام دوسری تہذیبوں سے منفرد ہے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ان قدروں پر مبنی ہونا چاہیے۔ اسلامی تہذیب اپنی اساسی اقدار اور تمدنی مظاہر کے لحاظ سے حیات کی وحدت کا تصور پیش کرتی ہے اس میں کسی سطح پر بھی ثنویت (Dualism) قابل قبول نہیں۔ وحدت کا یہ تصور فرد سے لے

---

۱ ایضاً، ۳۱۰

۶۰۔ ایضاً، ۳۱۱، اور ۳۱۲

کر اجتماع تک اور انسان سے لے کر کائنات تک ہر شئے میں جاری و ساری ہے۔ یہ تصور اسلامی تہذیب کی جان اور اس کی پہنچان ہے۔ اسے قربان کر دینا تہذیب کی قربانی کے مترادف ہو گا۔

اسلامی ثقافت ایک مخصوص ذہنی راستے کی نشاندہی کرتی ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے مرتب ہوتا ہے۔ یہ تہذیب عظمت و تکریمِ انسانیت، مساواتِ انسانی، عدل واحسان، انسانی ہمدردی اور خیر خواہی جیسی اہم خصوصیات سے مذین ہے۔ یہ خصوصیات دوسری تہذیب واقوام کے ساتھ تعلقات کی راہ متعین کرتی ہیں۔ اسلامی تہذیب دراصل روشنی کا مینار ہے جس سے اسلامی تمدن وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہی وہ مینار ہے جس نے پوری دنیا کی تہذیبوں کو اپنے اندر سمیٹا بھی اور متاثر بھی کیا۔

اسلامی ثقافت کا مقصد انسانی زندگی کے خارجی عناصر کو خوشنما بنانا نہیں بلکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بذات خود خوشنما بنانا اور سربلند کرنا ہے۔ اسلامی تہذیب کی روح سے حریت، سکینتِ قلب اور جذبہِ عمل پھوٹتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی اسی روح کا اثر پورے اسلامی معاشرے، اس کے اعمال اور اسلامی تمدن پر نمایاں ہوتا ہے۔ رسول ﷺ کی سیرت مبارکہ میں غیر مسلموں سے حسن سلوک اور تعلقات کے حوالے سے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن سے پرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر تعلقات اور بین الثقافتی اتحاد کے فروغ کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ میثاق مدینہ، صلح حدیبہ، معاہدہ نجران، فتح مکہ عہد نبی ﷺ کی ایسی مثالیں ہیں جن کی نظیر تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ معاہدات اسلام اور دوسرے مذاہب اور تہذابیوں کے درمیان، مفاہمت، تحمل، برداشت، رواداری کے فروغ اور انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے اہم مقام رکھتے ہیں۔

میثاق مدینہ

ہجرت مدینہ کے بعد رسول ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ کی ضرورت محسوس کی جس کی رو سے فریقین ایک دوسرے کے عقائد کے احترام اور ان کی شہری آزاد کے تحفظ کا وعدہ کریں یہ معاہدہ متن کے اعتبار سے حیرت انگیز اس معاہدے کے ذریعے آپ ﷺ نے اہل مدینہ کو اختلافات کے باوجود متحد کر دیا اور انہیں ایک نظام کے تابع کر دیا۔ آپ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا اور ان سے روابط استوار کر لیے۔[1]

میثاق مدینہ کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

ا۔ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلح رہے گی۔
۲۔ دونوں ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے۔
۳۔ اگر مدینہ پر کوئی بیرونی قوت حملہ کرے تو دونوں فریق مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔
۴۔ اگر دونوں قومیں میں تنازعہ پیدا ہو جائے تو حضور ﷺ کا فیصلہ تسلیم کرنا ہو گا۔

ا ۔ حمید اللہ، ڈاکٹر، پیغمبر اسلام، مترجم خالد پرویز، بیکن بکس لاہور، ۲۰۱۳ء، ۱۹۸

۵۔ فریقین کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ ۶۔ خون بہا اور فدیہ کا قدیم طریقہ رائج رہے گا۔[۱]

اس معاہدہ کی رو سے مدینہ کی فضا پر سکون ہو گئی۔ اسلام ریاست کی ابتداء ہوئی جس کی بنیاد حق و انصاف اور اخوت و مساوات پر رکھی گئی اور رنگ، نسل زبان اور مذہب کا امتیاز ختم کر کے اہل مدینہ ایک قوم بن گئے۔ یہ معاہدہ حضور ﷺ کی سیاسی بصیرت، مذہبی رواداری اور حسن تدبر کا ایسا تاریخی اور مثالی شاہکار ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی ہے۔ نامور عرب محقق اور سیرت نگار محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

"یہ وہ تحریری معاہدہ ہے جس کی بدولت حضرت محمد ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل ایک ایسا ضابطہ انسانی معاشرہ میں قائم کیا جس سے شرکاء معاہدہ میں ہر گروہ اور ہر فرد کو اپنے اپنے عقیدہ و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوا، انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی"[۲]

معاہدہ نجران اور بین التہذیبی یگانگت و ہم آہنگی

عیسائیوں کے ساتھ اتحاد و رواداری کی بہترین مثال "معاہدہ نجران" ہے۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جس کے ارکان کی تعداد ۶۰ تھی حضور ﷺ سے ملنے آیا۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا اس معاہدہ کی رو سے عیسائی اقلیت کو مذہبی رواداری اور ثقافتی ہم آہنگی کے صلے میں جو حقوق و مراعات حاصل ہوئی و مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ان کی جان محفوظ رہے گی۔ ۲۔ ان کی زمین، جائیداد اور مال وغیرہ ان کے قبضے میں رہے گا۔ ۳۔ ان کے کسی مذہبی نظام میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ ۴۔ مذہبی عہدے دار اپنے عہدوں پر برقرار رہیں گے۔ ۵۔ صلیبوں اور مورتیوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ۶۔ ان سے فوجی خدمت نہیں لی جائے گی۔[۳]

بین التہذیبی اور ثقافتی ہم آہنگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا درخشاں مثال ہو گی۔ اس معاہدے کے تحت عیسائی دنیا کو اتحاد و یگانگت کی دعوت ان الفاظ میں دی گئی کہ "آؤ اے اہل کتاب اس بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے۔ ہر مذہب کے عبادت خانوں، اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت کی ضمانت دی گئی۔

معاہدات کی پاسداری تہذیبی بقائے باہمی

عدل کا تقاضا ہے کہ جملہ معاہدات، مواثیق اور قرار دادوں کی بنیاد عدل پہ ہو سب کے ساتھ انصاف ہو اور اس کی بنیاد پر کوئی طاقتور کسی کمزور پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ لہذا عدل واضح ترین خصوصیت ہے جس سے متعلق جملہ انسانی تعلقات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس بارے میں احکام قرآن و سنت سے ثابت شدہ ہیں۔ عدل

---

۱ - حمید اللہ، ڈاکٹر، پیغمبر اسلام، ۲۱۵

۲ - ہیکل، محمد حسین، حیات محمد، عبداللہ اکیڈمی لاہور ۲۰۰۳ء، ۳۱۰

۳ - ایضا، ۳۷۵

دشمن کا ویسا ہی حق ہے جیسا کہ دوستوں کا حق ہے۔ غیر مسلموں کی مسلمانوں سے عداوت اور زیادتی کے باوجود ان سے ناانصافی درست نہیں، بلکہ دوسری اقوام اور تہذیبوں سے تعلقات عدل و تقوی پر مبنی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿یاَیُّھا الَّذین آمنوا کونوا قوّامین للہ شھداء بالقسط ولا یجرمنّکم شنآن قوم علٰی ألاّ تعدلوا اعدلوا ھو أقرب للتّقوی﴾ [1]

ترجمہ: ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ عدل کا دامن چھوڑ دو تم بہر حال انصاف کیا کرو یہ بات تقوی کے زیادہ قریب ہے۔

عدل، مساوات اور آزادی کی اقدار محض خواہشات ہی نہ رہیں بلکہ ضروری ہے کہ انھیں بر سرزمین عملی صورت دی جائے۔ قرآن حکیم وعدوں کے احترام، معاہدوں اور ذمہ داریوں کو کامل ترین صورت میں نبھانے کا صریح اور براہ راست حکم صادر کرتا ہے۔ اسلام نے عہد کو اخلاقی مرتبہ دے کر اسے تاکیدی الفاظ کے ساتھ حکم نامہ (Mandatory) بنا دیا ہے۔ اور اس اصول (معاہدات اور ذمہ داریوں کا امن و جنگ میں احترام) کا مسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں نبی ﷺ کے مبارک عہد سے لے کر آج تک ایک بلیغ اثر تھا اور ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿و اوفوا بالعھد انّ العھد کان مسؤلا﴾ [2]

ترجمہ: عہد کی پابندی کرو بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنا ہوگی۔

معاہدات اپنی عبارتوں سے قوت حاصل نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے عقد کرنے والوں کی عزیمت کے ساتھ وفا پر منحصر ہیں۔ اسلام بلاشبہ اسے عقیدہ ایمانی سے مربوط کر کے وفا کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلام معاہدات کی پاسداری کو نہ صرف قانونی ذمہ داری قرار دیتا ہے بلکہ اخلاقی اور دینی ذمہ داری اور ایمان کا تقاضہ بھی ہے۔ اس کی نظیر کسی قدیم و جدید ریاست کے قوانین میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید دھوکہ دہی، خیانت اور عہد شکنی سے منع کرتا ہے اور وضاحت کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہے۔ برابری کی بنیاد پر معاہدے اور مواثیق کی پاسداری تہذیبی تعلقات میں بنیادی عوامل شمار ہوتی ہے نیز یہ اصول وضاحت کرتا ہے کہ یہ وفا اور اخلاقیات کا اصول محض شکلی اور قانونی پہلوؤں تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ تعاون اور بقائے باہمی کی بنیاد کو راسخ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس ساری بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طاقت پر مبنی ثقافت مغرب کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک تو ہو سکتی ہے مگر اسلام کی یہ خصوصیت نہیں ہے اسلام میں قوت اور اقتدار کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور انسان اللہ

28۔ سورۃ المائدہ:۵/۸

29۔ سورۃ الاسراء:۱۷/۳۴

تعالیٰ کا نائب ہونے کی حیثیت میں زمین پر اس کا عطا کردہ اختیار استعمال کرتا ہے۔ خورشید احمد اس کی وضاحت کے لیے سید مودودی کے نظریات و افکار کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ اللہ کی تخلیق ہے، چنانچہ وہ اسی کے احکام کی بجا آوری کا پابند ہے۔ اسے زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ اللہ نے ہر انسان کو اپنی نیابت سے نوازا ہے اور وہ اللہ کے سامنے ہی اس بارے میں جوابدہ ہے۔ اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت میں انسان اپنے رب، مالک اور پروردگار کے احکام کے مطابق ہی اس دنیا کے معاملات کو چلانے کا پابند ہے۔ اللہ نے اپنا جو اختیار اسے عطا کر رکھا ہے وہ اللہ کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کو استعمال کرنے کا پابند ہے۔[۱]

اور مختصر یہی اسلام کی ثقافت ہے کہ اللہ تعالیٰ کل اختیار کا مالک ہے اور وہی ہے جو قانون دیتا ہے انسان اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت میں قانون سازی کرتا ہے اس پر عمل کرتا ہے اور اسی کے مطابق دنیا میں فیصلے کرتا ہے وہ اس دوران خود کو شریعت کی مقرر کردہ حدود کے اندر رکھتا ہے جو قرآن اور سنت پر مبنی ہیں۔[۲]

اس نظام فکر سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کی سیاسی ثقافت میں ایسی ناروا قوت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ جو انسانوں پر حاوی ہو اور ان کا استحصال کرے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں علاقوں کی توسیع ذاتی اقتدار اور شان و شوکت کے لیے نہیں کی جاتی، بلکہ یہ کام تو اللہ کی راہ میں کیا جاتا ہے تاکہ اس کے قوانین قائم اور نافذ کیے جاسکیں اور عوام کو ظالموں اور استبدادی حاکموں سے نجات دلائی جاسکے۔

باہم مکالمے کی ضرورت

اسلام دنیا کی دیگر تہذیبوں سے اختلافات کے باوجود تصادم کے نظریے کا قائل نہیں بلکہ مشترکات کی بنیاد پہ دنیا کو مل بیٹھنے اور مکالمے کی دعوت دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ کا ترجمہ ہے:

﴿قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا﴾

کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔[۳]

اسلام دوسرے مذاہب، ثقافتوں اور تہذیبوں میں اختلافات قبول کرتا ہے لیکن وہ ثقافتی اور تہذیبی سامراجیت کو مسترد کرتا ہے۔ اسلام، مغربی تہذیب کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ اس

---

1 ۔ Ahmad, Khurshid and Ansari Z.I, Islamic Perspective, p.366

۲ ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیمات، ج۳، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ۷-۶۸

۳۔ سورۃ آل عمران: ۳/ ۶۴

کی فلسفیانہ بنیاد کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد اس موضوع پر سید ابو الاعلی مودودی کے خیالات کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

سید مودودی مغربی تہذیب کے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور عمومی ذہنی قوت کے پظاہرے پر اہل مغرب کے معترف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مغربی تہذیب صحیح سمت کے شعور سے محروم ہے۔ غیر حقیقی بنیادی اصولوں کی وجہ سے انسان کی زندگی یا سماج اپنے اندر سے گل سڑ چکے ہیں۔[1]

اس کا واضح مطلب ہے کہ اسلام صرف اسی لیے مغرب کو سراسر قبول کرنے کا حامی نہیں جیسا کہ اہل مغرب اکثر قرار دیتے ہیں کہ اسلام مغرب سے بالکل مختلف ہے۔ اختلافات کا مطلب صرف تصادم یا محاذ آرائی نہیں ہوتا بلکہ اختلافات تو باہمی بات چیت اور مکالمے کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے دونوں کے درمیان مختلف نظریاتی اصولوں کی بنا پر اختلافات موجود رہیں لیکن مشترکہ اور انسانی مفاد کی بنیاد پر مختلف معاشروں کے درمیان باہمی مفاہمت اور تعاون کا قیام تو بالکل ممکن ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔

فطری طور پر اسلام اصولوں پر تو سمجھوتہ نہیں کرتا لیکن وہ اپنی حکمت عملی، تدبیروں اور طریق کار میں لچک دار ہیں۔ اہل اسلام کو معروضی طور پر جن مشکلات کا سامنا ہے ان کے مقابلے میں بھی وہ نرمی اور لچک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہمیں اس دنیا میں دوسروں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم سب اپنے سیاسی فکری اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے انسانی بھلائی پر مبنی نقطۂ نظر اختیار کریں گے۔ مگر اس کے برعکس ہن ٹنگٹن اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کو باہمی تصادم کی تناظر میں ہی دیکھنے پر مائل بلکہ بضد ہیں:

> "جب تک اسلام، اسلام رہتا ہے اور مغرب، مغرب تو دونوں عظیم تہذیبوں اور طرز حیات کے درمیان بنیادی تصادم ہی مستقبل میں تعلقات کا تعین کرتا رہے گا۔ جس طرح گزشتہ ۱۴ صدیوں کے دوران ہوتا چلا آیا ہے"۔[2]

اسلام اور مغرب کے درمیان رشتے کے کم از کم دو پہلوؤں پر غور کیا جانا چاہیے، ان میں سے پہلے کا تعلق تو ان اخلاقی اقدار اور اصولوں سے ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور دوسرا جو مغربی تہذیب کے تخلیق ہیں۔ بعض ایسے پہلو اور موضوعات موجود ہیں جہاں ان دونوں میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ لیکن بعض ایسی اقدار ہیں جن پر دونوں میں اختلاف ہے تاہم ہمیں ان اختلافات کو کسی خطرے کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ یا اسے کوئی ایسی چیز نہیں تصور کرنا چاہیے جو دشمنی اور تلخی پیدا کرنے کا موجب ہو۔ تاریخ میں ایک ایسا زمانہ بھی تھا جب خیالات اور اقدار کو سیاسی

---

1 -Ahmad, Khurshid and Ansari Z.I, Islamic Perspective, The Islamic Foundation, Leicestershire, 1979, p.368

2 Huntington,The Clash of Civilizations, P.212

طاقت کے ذریعے دوسروں پر ٹھونسا جاتا تھا۔ دور حاضر کی تاریخ کا ایک بڑا نمایاں پہلو آزادی اظہار آزدی مباحث اور آزادی ابلاغ ہے۔ ہمیں اسلام اور مغرب کے درمیان صحت مندانہ مکالمے، مذاکرات اور نظریات و خیالات کے تبادلے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

خلاصۂ بحث

تہذیبی تصادم کے نظریے کے بانی پروفیسر سیموئیل پی ہن ٹنگٹن کے خیال میں اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان تصادم ناگزیر ہو چکا ہے انھوں نے اس حدشے کا بھی برملا اظہار کیا ہے کہ اسلام کا عالمی تحرّک طاقت کے موجودہ توازن کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے تجویز کیا ہے کہ مغرب کو دوسری تہذیبوں کے خلاف ایسی استحصالی حکمت عملی پر کاربند ہونا چاہیے کہ صرف وہی دنیا کی بالادست تہذیب کے طور قائم رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کے مغرب دوسری تہذیبوں کے خلاف مسلسل جارحانہ حکمت عملی پر عمل پیرا ہے۔ لیکن اسلام دنیا کی دیگر تہذیبوں سے اختلافات کے باوجود تہذیبی تصادم کے نظریے کا قائل نہیں بلکہ مشترکات کی بنیاد پہ دنیا کو مل بیٹھنے اور مکالمے کی دعوت دیتا ہے اور دلیل کے ذریعے قائل کرتا ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب، ثقافتوں اور تہذیبوں میں اختلافات قبول کرتا ہے لیکن وہ ثقافتی اور تہذیبی سامراجیت کو مسترد کرتا ہے۔ اسلام نے تو انسانیّت کو ہر ممکن عدم تصادم اور امن کا تصوّر اور نظریہ دیا ہے۔ اسلام نے تو عین میدان جنگ میں بھی تصادم میں پہل کرنے سے روکا ہے۔ اسلامی تہذیب جن اقدار پر کھڑی ہے، اس میں حفظِ مراتب ایک بنیادی قدر ہے۔ یہ الہام کو اپنی اساس مانتی اور اس سے وابستہ ہر تصور کو مقدس سمجھتی ہے۔ االلہ، رسول ﷺ، کتاب اللہ، یہ سب الہامی تصورات ہیں۔ وہ حسبِ مراتب انکو محترم جانتی اور انکی توہین کے لیے، اس کی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ اس کثیر تہذیبی دنیا میں اگر عالمی امن وسکون درکار ہے تو سبھی تہذیبوں کو باہمی مصالحت امیز رویہ اختیار کرنا اور ایک دوسرے کے لیے گنجائش پیدا کرنا ہو گی اگر مغرب دوسری تہذیبوں کے بارے میں برداشت کا مظاہرہ کرے اور استحصالی پالیسیوں سے حترازکرے تو بین التہذیبی تصادم کو روکا جاسکتا ہے۔

نتائج وسفارشات

۱. تہذیبی تصادم کے نظریے کے بانی پروفیسر سیموئیل پی ہن ٹنگٹن پروفیسر پی ہن ٹنگٹن نے تجویز کیا ہے کہ مغرب کو دنیا کی بالادست تہذیب کے طور قائم رہنے کے لیے دوسری تہذیبوں کے خلاف استحصالی حکمت عملی پر کاربند ہونا چاہیے۔ مغرب کا دیگر تہذیبوں کے بارے میں رویہ اسی تہذیبی تصادم کے نظریے کے گرد گھومتا ہے۔

۲. تہذیبی تصادم کے اس نظریے کے برعکس اسلام دنیا کی دیگر تہذیبوں کے حاملین کے ساتھ مشترکات کی بنیاد پر مل بیٹھنے اور مکالمے کے فروغ کی دعوت دیتا ہے۔

۳. اسلام تصادم پر یقین نہیں رکھتا بلکہ بقاء باہمی کا درس دیتا ہے کیوں کہ وہ دعوت اور فلاح کا دین ہے۔ وہ ہر تہذیب کو کھلی دعوت کے ذریعے قائل کرتا ہے، لیکن اپنے دفاع سے بے خبر بھی نہیں۔ وہ کمزوروں کی مدد اور اپنے دفاع کے لیے جہاد کا حکم دیتا ہے۔

۴. اسلامی تہذیب میں حفظِ مراتب ایک بنیادی قدر ہے۔ یہ الہام کو اپنی اساس مانتی اور اس سے وابستہ ہر تصور یعنی اللہ، رسول ﷺ تمام انبیاءؑ، کتاب اللہ کو مقدس سمجھتی ہے۔ وہ حسبِ مراتب انکو محترم جانتی اور انکی توہین برداشت نہیں ہے۔ لہذا تمام تہذیبیں مقدسات کے احترام کو یقینی بنائیں اور اقوام متحدہ اور او آئی سی مقدسات کی توہین کے واقعات کی روک تھام کے لیے عالمی سطح پر مؤثر قانون سازی کا اہتمام کرے۔ یہ امن عالم کے لیے ضروری ہے۔

۵. اس کثیر تہذیبی دنیا میں اگر عالمی امن وسکون درکار ہے تو سبھی تہذیبوں کو باہمی مصالحت امیز رویہ اختیار کرنا اور ایک دوسرے کے لیے گنجائش پیدا کرنا ہو گی اگر مغرب دوسری تہذیبوں کے بارے میں برداشت کا مظاہرہ کرے اور استحصالی پالیسیوں سے احتراز کرے تو بین التہذیبی تصادم کو روکا جا سکتا ہے۔